شاہد حسین رزاقی

یادوں کے چراغ

کل ہند مسلم لیگ کے اجلاسِ لکھنؤ میں میں نے قائداعظم علیہ الرحمۃ کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ ان سے پہلی بار ملاقات کا شرف حیدرآباد دکن میں حاصل ہوا، جب وہ گولکنڈہ سگریٹ فیکٹری کے مقدمہ میں پیروی کرنے کے لیے تشریف لاتے تھے۔

قائد اعظم سلیمہ خاتون کے وکیل تھے اور فریقِ ثانی کے وکیل سر تیج بہادر سپرو تھے چنانچہ اس مقدمہ نے بڑی شہرت اور اہمیت حاصل کر لی تھی۔ قائدِ اعظم کی آمد غیر معمولی سیاسی اہمیت کی حامل بھی تھی۔ مسلمان اپنے محبوب قائد کو دیکھنے کے لیے بے تاب تھے۔ ہائی کورٹ میں کمرۂ عدالت، برآمدوں اور صحن میں لوگوں کا ہجوم تھا۔ جب قائد اعظم تشریف لائے تو لوگوں نے تالیاں بجا کر اور "محمد علی جناح زندہ باد" اور "مسلم لیگ زندہ باد" کے نعرے لگا کر استقبال کیا۔ کمرۂ عدالت میں ہجوم کی کیفیت قابلِ دید تھی۔ مقدمہ کا آغاز سر تیج بہادر سپرو کی بحث سے ہونے والا تھا لیکن انھوں نے کہا کہ عوام مسٹر جناح کی بحث سننے کے مشتاق ہیں۔ اگر عدالت اجازت دے اور مسٹر جناح پسند کریں تو میں ان سے بحث کا آغاز کرنے کی درخواست کروں گا۔ چنانچہ قائد اعظم نے بحث شروع کی۔ سب کی نظریں ان پر جمی ہوئی تھیں جج بھی بڑے مرعوب نظر آتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک جج جیون یار جنگ نے قائد اعظم کی طرف قلم سے اشارہ کرتے ہوئے کچھ سوال کیا۔ قائد اعظم کو یہ اندازِ تخاطب پسند نہ آیا اور انھوں نے کسی قدر زور سے اپنا پیر زمین پر پٹکا۔ اس پر جیون یار جنگ کے ہاتھ سے قلم گر پڑا۔ اور مجمع نے تالیاں بجائیں۔ اگرچہ یہ عدالت کے وقار کے مناسب نہ تھا لیکن مجمع کی کیفیت دیکھ کر جج بھی خاموش رہے۔

قائدِ ملت بہادر یار جنگ کا بیشتر وقت قائد اعظم کے ساتھ گزرتا تھا۔ انھوں نے حیدرآباد

کے موجودہ حالات، ان کے عواقب و نتائج اور پیشِ نظر مسائل پر قائد اعظم سے تبادلۂ خیال کیا۔ حیدر آباد کی سیاسی تحریکوں، حکومت کی پالیسی اور دربار کی حالت سے مطلع کیا اور قائد اعظم سے ضروری مشورے کیے۔ ان کی صدارت میں مجلسِ اتحاد المسلمین کا عظیم الشان جلسہ عام ہوا جس میں قائدِ اعظم نے تقریر فرمائی۔ قائدِ ملت کے عصرانے میں قائد اعظم نے مجلس کے رہنماؤں اور سربرآوردہ شہریوں سے ملاقات کی اور جامعہ عثمانیہ کے طلبا اور متعدد اداروں کے وفود کو شرفِ باریابی بخشا۔

اس سلسلے میں نظام سے ملاقات کو بھی ضروری خیال کیا گیا چنانچہ قائد اعظم نے نظام کو اپنی آمد کی اطلاع دی اور نظام نے قائد اعظم کو اپنے محل "کنگ کوٹھی" میں ملاقات کے لیے مدعو کیا۔ نظام بالعموم ایک برآمدے میں بیٹھتے تھے جس میں ایک میز اور ایک کرسی رکھی رہتی تھی اور برآمدے کے نیچے صحن میں درباری نہایت ادب سے دست بستہ کھڑے رہتے تھے لیکن معزز ملاقاتیوں سے ملنے کے لیے خاص کمرہ تھا، جہاں مقررہ وقت سے پہلے ملاقاتی بٹھا دیے جاتے اور کافی، سگریٹ وغیرہ سے ان کی تواضع کی جاتی۔ ٹھیک وقت پر ایک پردہ ہٹایا جاتا اور نظام کمرہ میں آجاتے۔ اسی کمرہ میں قائد اعظم اور نظام کی ملاقات ہوئی۔ نظام نے ریاست کے بعض اہم مسائل کے بارے میں قائد اعظم کی رائے دریافت کی اور انھوں نے نہایت آزادی اور صفائی سے اپنے خیالات ظاہر کیے۔ نظام نے قائد اعظم کی رائے اور ان کے مشوروں کو بہت پسند کیا اور پھر ملاقات کرنے کی خواہش کی، جس سے قائد اعظم نے اتفاق فرمایا۔

حیدر آباد کے وزیر اعظم اکبر حیدری انتہائی ہندو نواز تھے اور ایک ایسا دستور نافذ کرنا چاہتے تھے، جس کے مطابق ہندو اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے۔ قائدِ ملت بہادر یار جنگ ایسا کوئی دستور قبول کرنے کو تیار نہ تھے جو ریاست کے حکمران مسلمانوں کو ایک محکوم اقلیت بنا دے۔ چنانچہ حیدری کی حکومت اور مسلمانانِ دکن کی واحد نمائندہ تنظیم مجلس اتحاد المسلمین کے درمیان شدید کشمکش شروع ہو گئی۔ قائد اعظم کی آمد سے حیدری نہایت پریشان اور خوف زدہ تھے جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ قائد اعظم نے نظام کو جو مشورے دیے ہیں وہ ان کی اور حیدر آباد میں متعین انگریز

ریزیڈنٹ کی پالیسی کے خلاف ہیں تو انھوں نے ریزیڈنٹ سے ملاقات کی۔ حیدری اور ریزیڈنٹ دونوں بہت فکرمند تھے اور آخرکار یہ طے کیا گیا کہ ریزیڈنٹ قائدِ اعظم کو ڈنر پر مدعو کرکے اکبر حیدری کی پالیسی کی وکالت کریں۔ لیکن قائدِ اعظم نے یہ دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اولاً تو ریزیڈنٹ سے تعارف نہیں۔ اور دوسرے یہ کہ مصروفیات اس کی اجازت نہیں دیتیں۔ ریزیڈنٹ نے کہا کہ وہ اہم مسائل پر گفتگو کرنا چاہتا ہے اس لیے ملاقات ضرور ہونی چاہیئے تو قائدِ اعظم نے فرمایا کہ ان مسائل کی نوعیت معلوم ہونے کے بعد ہی وہ غور کر سکتے ہیں۔ آخرکار ریزیڈنٹ نے یہ خواہش کی کہ قائدِ اعظم دوبارہ نظام سے نہ ملیں یا خود اس سے ملنے تک یہ ملاقات ملتوی کر دیں، لیکن قائدِ اعظم نے یہ مشورہ ماننے سے بھی انکار کر دیا۔ اب ریزیڈنٹ بہت جز بز ہوا اور یہ کہلایا کہ قائدِ اعظم پہلی ٹرین سے حیدرآباد سے چلے جائیں۔ قائدِ اعظم نے جواب دیا کہ ریزیڈنٹ کو اس قسم کا حکم دینے کا اختیار نہیں ہے، اور اگر ہے تو وہ تحریری حکم دے۔ ریزیڈنٹ اس کا کوئی جواب نہ دے سکا اور قائدِ اعظم نے نظام سے پھر ملاقات کی۔

قائدِ اعظم حکومت کے مہمان تھے۔ میں ان سے ملنے اور گفتگو کرنے کا آرزومند تھا۔ ایک روز میں نے قائدِ ملت سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ سرکاری مہمان خانہ ہرمیٹج لے گئے اور نہایت اچھے الفاظ میں قائدِ اعظم سے میرا تعارف کرایا۔ شاید انہی تعریفی کلمات کے باعث بہت توجہ فرمائی اور کوئی پندرہ منٹ تک گفتگو کرتے رہے۔ میں اپنی اس خوش نصیبی پر بہت مسرور و نازاں اور قائدِ ملت کا شکرگزار تھا۔ اس کے بعد طلبا کے ایک وفد کے ساتھ میں قائدِ اعظم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہ ملاقات بہت مختصر تھی۔

بمبئی صوبائی مسلم لیگ کے سالانہ جلسہ منعقدہ شولاپور میں مجلسِ استقبالیہ کے صدر کی مہربانی سے مجھے ڈائز پر جگہ مل گئی تھی اور میں نے قائدِ اعظم کو بہت نزدیک سے دیکھا تھا۔ مسلم لیگ کے اجلاسِ لاہور میں اپنے قائد کو دور سے بھی دیکھا اور نزدیک سے بھی۔ اور قائدِ ملت کی عنایت سے ملاقات کا شرف بھی حاصل کر لیا، لیکن میری آرزو یہ تھی کہ قائدِ اعظم سے تفصیلی ملاقات ہو، اور میں ان سے مختلف امور پر دل کھول کر باتیں کر سکوں۔ میری یہ آرزو جون ۱۹۴۰ میں

پوری ہوئی۔

مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کے بعد میں اپریل کے آخر میں حیدرآباد واپس ہوا اور دو مرتبہ اس خیال سے بمبئی گیا کہ شاید قائد اعظم سے ملاقات کی کوئی شکل نکل آئے۔ جب دونو مرتبہ ناکامی ہوئی تو میں مہابلیشور چلا گیا، جہاں میری بھاوج بیگم سجاد حسین رزاقی اور ان کی دختر قمر سلطانہ گرمیاں گزارنے کے لیے گئی تھیں۔ مہابلیشور میں دو ہفتے قیام کرنے کے بعد میں نے پھر بمبئی کا رخ کیا، اس توقع پر کہ شاید اس مرتبہ ملاقات کا موقع مل جائے۔ چنانچہ میں نے پہلا کام یہی کیا کہ ملاقات کا وقت مقرر کرانے کے لیے ٹیلی فون کیا۔ مگر معلوم ہوا کہ قائد اعظم بہت مصروف ہیں اور ایک ہفتہ کے بعد ملاقات ہو سکے گی۔ اتنے دن بمبئی میں قیام کرنا مشکل تھا اس لیے مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔

بھابی جان اور قمر سلطانہ کو بھی قائد اعظم سے ملنے کی بڑی آرزو تھی۔ میں اپنے ایک دوست محمد علی منیار صاحب کے پاس گیا جو بمبئی مسلم لیگ کے بہت مخلص کارکن تھے اور قائد اعظم سے ان کے دیرینہ مراسم تھے۔ میں نے منیار صاحب سے کہا کہ وہ ملاقات کی کوئی شکل نکالیں اور انھوں نے پوری کوشش کرنے کا وعدہ کیا۔ رات کو انھوں نے اطلاع دی کہ صبح دس بجے قائد اعظم سے ملنے کا وقت تو مقرر ہو گیا ہے لیکن وہ بہت مصروف ہیں اس لیے صرف دس منٹ دیے گئے ہیں۔ ہمارے لیے یہ دس منٹ بھی ایک نعمتِ غیر مترقبہ تھے۔ مجھے دیر تک نیند نہ آئی اور کئی باتیں ذہن میں گھومتی رہیں جن پر میں قائد اعظم سے گفتگو کرنا چاہتا تھا لیکن ساتھ ہی خیال آجاتا کہ دس منٹ کی ملاقات میں اس کا موقع ہی کہاں ملے گا۔

صبح نو بجے منیار صاحب آگئے اور ان کے ساتھ ہم مالا بار ہلز کے دلکش مناظر سے محظوظ ہوتے ہوئے قائد اعظم کے خوب صورت مکان پر پہنچ گئے جو حال ہی میں ماؤنٹ پلیزنٹ روڈ پر از سرِ نو تعمیر کیا گیا تھا۔ منیار صاحب نے قائدِ اعظم کے سکریٹری سے کچھ باتیں کیں اور پھر ہم کو ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا۔ چند منٹ کے بعد قائد اعظم تشریف لے آئے۔ ہم سب نے کھڑے ہو کر سلام کیا اور منیار صاحب نے تعارف کرایا۔

---

*میں قائد اعظم کے بہت قریب ایک کرسی پہ بیٹھ گیا۔ منیار صاحب نے مسلم لیگ کے ۔ میرے جوش و خروش کا حال بیان کرتے ہوئے کہا کہ قائد اعظم یہ وہی صاحب ہیں جنھوں ۔ گاندھی جی سے بھی آپ کو قائد اعظم کہلوایا۔ گلبرگہ دکن سے گاندھی کو وہ تار انہی نے دیا تھا جس کا ح دے کر گاندھی نے آپ کو لکھا تھا کہ وہ آئندہ سے آپ کو قائد اعظم کہیں گے ۔

میں نے کہا کہ گاندھی کے کہنے یا نہ کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ قائد اعظم خود اس کا بہت دلچسپ جواب دے چکے ہیں کہ گلاب کو کوئی گلاب کہے یا نہ کہے وہ بہرحال گلاب ہی رہے گ یہ سن کر قائد اعظم مسکرا دیے ۔

میں نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ مجھے تو بڑا مزا اس بات میں آیا کہ میرا تار دیکھ کر گاندھی جی بلبلا اُٹھے اور اپنے اشتعال کو چھپانے کے لیے یہ کہنے لگے کہ مَیں مشتعل نہیں ہوا قائد اعظم نے فرمایا کہ تم نے کون سی ایسی بات کہی تھی کہ ایک تار اتنے لمبے چوڑے قصّے کی بنیاد بن گیا۔ میں نے عرض کیا کہ یہ قصّہ تو بالکل غیر متوقع تھا۔ بات صرف اتنی ہے کہ کانگریسی وزارتوں کے مستعفی ہونے پہ مجھے بے انتہا خوشی ہوئی تھی اور آپ کے کہنے کے مطابق ”یوم نجات“ منانے کے لیے میں نے گلبرگہ میں بڑی تیاری کی تھی۔ اس روز اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں نے مسٹر گاندھی کو تار دے دیا جس کا مضمون تھا ”یوم نجات کی مبارک باد۔ قائد اعظم جناح زندہ باد“۔ گاندھی جی اس طنز کو برداشت نہ کر سکے اور یہ اعلان کر دیا کہ ان کو مشتعل کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن وہ مشتعل نہیں ہوئے اور آئندہ سے وہ بھی مسٹر جناح کے بجائے قائد اعظم کہیں گے کیونکہ ہندوستانی نام کے ساتھ مسٹر لکھنا ان کو پسند نہیں۔

پھر مَیں نے کہا کہ قائد اعظم میرا خیال تو یہ ہے کہ گاندھی نے اس توقع پہ آپ کو قائد اعظم کہنے کا فیصلہ کیا تھا کہ اس کے جواب میں آپ ان کو مہاتما کہنے لگیں گے لیکن آپ کے جواب سے ان کی امیدوں پہ پانی پھر گیا۔ قائد اعظم نے فرمایا کہ بڑی مشکل یہی ہے کہ مسٹر گاندھی مہاتما سمجھے جاتے ہیں۔ اگر وہ مہاتمائیت کی چوٹی سے زمین کی سطح پہ اتر آئیں تو حقیقت پسند بن جائیں گے ۔ ملک کے حالات ان کو تمام حقائق کو تسلیم کرنے پہ مجبور کر دیں گے ۔

اس کے بعد قائد اعظم خواتین سے باتیں کرنے لگے۔ اتنے میں محترمہ فاطمہ جناح بھی آ گئیں۔

منیار صاحب نے ان سے ہمارا تعارف کرایا اور وہ دونوں خواتین کے درمیان بیٹھ گئیں۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا اور قائد اعظم سے کہا کہ ابھی تو مجھے بہت کچھ کہنا ہے لیکن آپ نے صرف دس منٹ دیے تھے۔ اس لیے اب اجازت چاہتا ہوں۔ قائد اعظم نے کہا کہ میں تم کو اور وقت دوں گا۔ ابھی بیٹھو۔

میں قائد اعظم سے پہلے مل چکا تھا اور جب یہ یاد دلایا تو انھوں نے بہادر یار جنگ کا حال پوچھا۔ میں نے کہا کہ آج کل ان کو سب سے بڑی فکر یہ ہے کہ کسی طرح خاکساروں کا مسئلہ بخیر و خوبی حل ہو جائے۔ قائد اعظم نے کہا کہ نواب بہادر نے اس کے لیے بہت کوشش کی ہے اور وہی اس کام کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہیں۔

جب خاکساروں کے متعلق گفتگو ہونے لگی تو میں نے قائد اعظم سے اس واقعہ کا ذکر کیا کہ ایک مرتبہ میں نواب بہادر یار جنگ کے ساتھ دہلی کے کارونیشن ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ وہاں کچھ لوگ خاکساروں کے بارے میں نواب صاحب سے گفتگو کرنے آئے اور علامہ مشرقی کی طرف سے یہ پیغام دیا کہ نواب صاحب اب بھی خاکسار تحریک کے لیے پہلے کی طرح کام کریں اور اس کو مسلم لیگ پر ترجیح دیں۔ اس کا جواب نواب صاحب نے یہ دیا کہ میں خود علامہ صاحب سے کہہ چکا ہوں اور آپ پھر میرا یہ جواب ان کو پہنچا دیں کہ میں اس بات کو تو تسلیم کرتا ہوں کہ مسلم لیگ کی طرح خاکسار تحریک بھی ایک مفید ملی تحریک ہے اور مسلم قوم کو منظم کرنا دونوں کا مقصد ہے لیکن دونوں کی نوعیت اور ضرورت میں بڑا فرق ہے۔ اگر مجھے حیدر آباد سے دہلی تک سفر کرنا ہے تو یہ تو ہو سکتا ہے کہ میں اپنے گھر سے اسٹیشن تک خاکسار تحریک کے تانگے پر چلا جاؤں، لیکن دہلی تک اس تانگے میں نہیں جا سکتا۔ دہلی تک تو مجھے مسلم لیگ کی ریل میں سفر کرنا ہے۔ یہی مجھے منزل مقصود تک پہنچا سکتی ہے۔ قائد اعظم اس واقعہ کو دلچسپی سے سنتے رہے اور اس جواب کو بہت سراہا۔

لاہور میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے دنوں میں جو کیفیت تھی وہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا اور خاکساروں سے مجھے ایک دلی تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ اسی جذبے کے تحت میں نے قائد اعظم سے کہا کہ آپ پوری قوم کے قائد ہیں اور خاکساروں کا مسئلہ بھی آپ ہی کو حل کرنا ہے

ہماری ملی جدوجہد میں خاکسار ایک بڑی قوت ثابت ہو سکتے ہیں کیونکہ جو لوگ اس قدر منظم، مخلص اور وفادار ہوں کہ اپنے لیڈر کے اشارے پر جانیں قربان کر دیں۔ اگر صحیح طور پر ان سے کام لیا جائے تو وہ یقیناً ملک و ملت کے لیے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

قائد اعظم نے موجودہ حالات پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہا کہ اس مسئلہ کو بہت غور و فکر اور صبر و تحمل سے حل کرنے کی ضرورت ہے لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ کسی معقول نتیجے پر پہنچنے میں سب سے بڑی رکاوٹ علامہ مشرقی کا طرزِ عمل ہے۔ وہ بیک وقت مجھے قائدِ اعظم بھی کہتے ہیں اور انگریزوں ایجنٹ بھی۔ ایک وعدہ کرتے ہیں اور پھر اس سے انکار کر دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں کوئی معقول تصفیہ کیسے ہو سکتا ہے۔

میں نے عرض کیا کہ نواب بہادر یار جنگ سے مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ اس سلسلہ میں یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ خاکساروں کو مسلم لیگ نیشنل گارڈ میں شامل کر لیا جائے یا ایک شخص کو تحریک کا امیر بنانے کے بجائے تین اشخاص پر مشتمل پریسیڈیم (صدریہ) قائم کر دیا جائے اگر ایسی کوئی صورت اختیار کی جا سکے تو مشرقی صاحب کی آمریت ختم ہو جائے گی۔

قائد اعظم نے فرمایا کہ تجویزیں تو بہت سی ہیں۔ لیکن تصفیہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب علامہ مشرقی اس پر آمادہ ہوں۔ اس لیے کہ یہ پوری تحریک ہی امیر کی اطاعت کے اصول پر قائم ہے اور کسی غیر شخص کے لیے اس ڈھانچے کو بدلنا ممکن نہیں۔

لاہور میں قراردادِ پاکستان کی منظوری سے نہ صرف ہندو رہنما بلکہ کانگریسی مسلمان بھی بدحواس ہو گئے تھے اور بے سر و پا بیانات دے رہے تھے۔ اس ملاقات میں یہ موضوع بھی زیرِ بحث آ گیا۔ میں نے ابوالکلام آزاد کی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ آج ہندو کانگریس ابوالکلام کو آلۂ کار بنا کر ہماری ملی تحریک کو جتنا نقصان پہنچا رہی ہے، مونجے، ساورکر اور پٹیل کی دشمنی ہم کو اتنا نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ آپ ابوالکلام آزاد کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔

قائد اعظم کے چہرے پر تأسف کے آثار ظاہر ہوئے اور انھوں نے کسی قدر آہستہ لہجے میں

فرمایا کہ ابوالکلام آزاد ناسمجھ نہیں ہیں، جو شخص غلطی اور ناواقفیت کی وجہ سے غلط راستے پر چل رہا ہو اس کو صحیح راستے پر لایا جا سکتا ہے، لیکن جو شخص جان بوجھ کر غلط راستے پر چلے اور اس پر اصرار کرے اس کو صحیح راستے پر کیسے چلایا جا سکتا ہے؟ بنگال اور میسور کی تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ ملت فروشوں کی وجہ سے ہماری قوم کتنی تباہی آئی۔ یہ بات ایسی ہے جس کو اسکول کا ایک لڑکا تک جانتا ہے۔ کیا ابوالکلام آزاد اور دوسرے کانگریسی مسلمان نہیں جانتے؟ اب اس کا جواب یہی ہے کہ ہم پوری کوشش کرکے ابوالکلام آزاد اور ان کے ہم نوا مسلمانوں کو بالکل غیر موثر بنا دیں تاکہ ان کی آڑ لے کر کانگریس ہم کو زیادہ نقصان نہ پہنچا سکے۔

قائداعظم چند لمحے خاموش رہے اور پھر فرمایا کہ کسی قوم کو کمزور بنانے اور کسی ملک کی جڑیں کھوکھلی کر دینے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اس قوم میں انتشار پیدا کر دیا جائے۔ ہٹلر نے اس حربے سے زبردست کام لیا ہے۔ آج کل اخباروں میں پانچویں کالم کی سرگرمیوں کا بڑا چرچا رہتا ہے اور تم دیکھتے ہو کہ اس جنگ میں یہ حربہ کس قدر کارگر ثابت ہوا ہے۔ مسلمانوں میں انتشار پیدا کرنے اور ان کی صفوں میں رخنے ڈالنے کے لیے کانگریسی لیڈر بھی اس حربے سے کام لینے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ اس کوشش کو ناکام بنانے کے لیے ہمیں ہوشیار رہنا چاہیے۔

میری دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ قائداعظم بڑے مشفقانہ انداز میں باتیں کر رہے تھے اور مجھے آزادی کے ساتھ اظہارِ خیال کا موقع دیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد مسلم لیگ کے متعلق گفتگو ہونے لگی اور میں نے مسلم لیگ کی ابتدائی شاخوں اور ان کی تنظیم پہ اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے مرکز کو تو بہت مستحکم اور طاقتور کر دیا ہے لیکن مقامی تنظیم کے لیے کچھ نہیں کیا۔

قائداعظم نے اپنا داہنا ہاتھ کسی قدر اونچا کرکے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا، ادھر دیکھو اور میرے سوال کا جواب دو۔ میں بھی مسلمان ہوں اور تم بھی مسلمان ہو۔ اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے قوم کی خدمت کرنا ہم دونوں کا فرض ہے۔ میں نے اتنا کام کیا ہے۔ تم نے کیا کیا؟ میرے برابر کام کرنے کے بعد ہی تم مجھ پہ اعتراض کر سکتے ہو۔ میں نے کہا۔ جناب میں صرف مسلمان ہوں اور آپ قائداعظم بھی ہیں۔ اس لیے میرا اور آپ کا کوئی مقابلہ نہیں۔

قائد اعظم نے جواب دیا کہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا صدر ہوں اور اس حیثیت سے اپنا کر رہا ہوں۔ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ میں پرائمری اور ڈسٹرکٹ لیگوں کا کام بھی کرنے لگوں تو یہ با غلط بات ہے۔ میں اپنا کام کرتا ہوں اور تم سب اپنا اپنا کام کرو۔

چند لمحوں کے وقفے کے بعد قائد اعظم نے گفتگو کا سلسلہ پھر شروع کیا اور فرمایا کہ مسل قوم کھلے میدان میں بے سہارا پڑی تھی۔ بھیڑیے ہر طرف سے حملے کر رہے تھے اور میں نے ا قوم کے گرد مسلم لیگ کی مضبوط فصیل بنا کر ان کو محفوظ کر دیا ہے اور خود اس فصیل کے پھا پر کھڑا ہو کر اس کی حفاظت کر رہا ہوں۔ اب یہ تمہارا فرض ہے کہ اس تحفظ سے پورا فائدہ اٹھ اپنی حالت درست کرو اور فصیل میں کوئی شگاف نہ آنے دو۔

یہ زمانہ مسلمانوں کی تاریخ کا بہت ہی نازک دور تھا۔ ہندوستان کے تمام بڑے اور بااثر اخبارات ہندوؤں کے ہاتھ میں تھے۔ نشر و اشاعت میں مسلمانوں کی کمزوری سے ان کو بہت نقصان پہنچ رہا تھا۔ چنانچہ قائد اعظم نے مسلم پریس کے لیے سرمایہ فراہم کرنے کی اپیل کی تھی۔ میں نے اس کے متعلق دریافت کیا تو قائد اعظم نے فرمایا کہ ابھی پوری رقم جمع نہیں ہوئی۔ مجھے اس بات پر بہت تعجب ہوا اور میں نے کہا کہ حیدرآباد میں مجلس اتحاد المسلمین نے تو پریس کے لیے پانچ لاکھ روپے جمع کر لیے۔ لیکن حیرت ہے کہ مسلم لیگ نہ کر سکی۔ قائدِ اعظم نے فرمایا کہ یہ کس نے کہا ہے کہ مجلس نے پانچ لاکھ روپے جمع کر لیے ہیں۔ کچھ دن پہلے مجھے اطلاع دی گئی تھی کہ صرف ستانوے ہزار روپے جمع ہوتے ہیں۔ قائد اعظم کی یہ اطلاع درست تھی۔ اور حیدرآباد واپس جانے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ ابھی صرف ایک لاکھ روپے جمع ہوتے ہیں۔

میں نے اس سلسلے میں قائد اعظم سے یہ بے تکا سوال بھی کر دیا کہ آپ چندے کے لیے اپیل کرنے کے بجائے اپنی دولت مسلم لیگ کو کیوں نہیں دے دیتے۔ اس سوال کے ساتھ ہی مجھے یہ خیال آیا کہ قائد اعظم کہیں ناراض نہ ہو جائیں۔ لیکن انھوں نے اسی لہجے اور انداز میں باتیں کرتے ہوئے جواب دیا کہ تمھارا مطلب یہ ہے کہ میں اپنا سب کچھ دے کر خود دوسروں کا دستِ نگر بن جاؤں؟ ایک بات یاد رکھو۔ اس ملک میں کئی مسلمان لیڈر صرف اسی لیے

نام ہوئے کہ انھوں نے اپنی مالی حالت کو تباہ کر لیا تھا۔ مولانا محمد علی کے خلوص اور ایمانداری ر کوئی شک نہیں کر سکتا اور ان کی قومی خدمات سے کسے انکار ہو سکتا ہے لیکن بدنام کرنے الوں نے ان کو بھی نہ چھوڑا۔ جہاں یہ صورت ہو وہاں لیڈروں کو بہت محتاط رہنا چاہیے۔ م نے بھی تو کچھ سوچا ہوگا کہ کئی سیاسی رہنما بدنام کیوں ہو گئے۔

میں نے عرض کیا کہ میرے خیال میں بعض لیڈر خاص کر تحریکِ خلافت کے کئی رہنما صرف س لیے بدنام ہوئے کہ انھوں نے ذمہ داری اور احتیاط سے کام نہیں لیا اور چندے لی رقمیں غائب یا ضائع ہو گئیں۔ مخالفوں نے فائدہ اٹھا کر ان لیڈروں کو بدنام کر دیا۔ بدقسمتی سے ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو لیڈر کی خدمات کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور یہ یاد رکھتے ہیں کہ جب وہ جلسہ میں آیا تھا تو اس کو کرایہ دیا گیا تھا، اس لیے مخالفوں کا پروپیگنڈا کامیاب رہا۔

قائد اعظم نے فرمایا کہ اپنے سوال کا جواب تم نے خود ہی دے دیا۔ بقول تمھارے جہاں یہ حال ہو کہ لوگ لیڈر کے کام کو تو بھول جائیں اور یہ یاد رکھیں کہ جب وہ ان کے جلسے میں تقریر کرنے آیا تھا تو اس کو کرایہ دیا گیا تھا وہاں لیڈر کی محتاجی اس کی بدنامی کا سب سے بڑا سبب بن جاتی ہے۔ مجھے جن اداروں یا لوگوں کو جو کچھ دینا ہے وہ مناسب طریقہ سے دوں گا اس طرح نہیں جیسے کہ تم کہہ رہے ہو۔

قائد اعظم کے مخالف ہر موقع سے فائدہ اٹھا کر ان کے خلاف گمراہ کن پروپیگنڈا کر رہے تھے۔ دہلی اور لکھنؤ کے سفر میں مجھے کانگریسی مسلمانوں کی بعض مذموم کوششوں کا علم ہوا تھا اور کچھ دیر تک اس بارے میں بھی قائد اعظم سے بات چیت ہوئی۔ پھر میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ سوا گیارہ بج چکے تھے۔ میں نے قائد اعظم سے اجازت طلب کی اور ہم سب باہر جانے لگے۔ قائد اعظم نے میرے شانے پہ ہاتھ رکھ دیا اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے موٹر تک آئے۔ میں نے قائد اعظم کا شکریہ ادا کیا اور مصافحہ کرتے ہوئے ان کے ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگا لیے۔ انھوں نے بڑی شفقت سے میری طرف دیکھا اور فرمایا کہ ایک بات ہمیشہ یاد

رکھو۔ اسلام اور مسلمانوں کی ممکنہ خدمت ہر مسلمان پر لازم ہے۔ یہ ہمارا مذہبی فرض ہے۔ ہماری تحریک کو نوجوانوں سے بڑی توقعات ہیں اور مجھے یقین ہے کہ یہ توقعات پ ہوں گی۔

قائد اعظمؒ سے یہ ملاقات میری زندگی کے اہم ترین واقعات میں سے تھی اور ہم سب اس بہت خوش اور نازاں تھے۔ مجھے بار بار خیال آتا تھا کہ قائد اعظم ہم سے اس قدر شفقت و عنای سے پیش آئے، نہ معلوم کچھ لوگ ان کو مغرور اور بد دماغ کیوں کہتے ہیں۔ اور جب قائد اعظم کئی بار ملنے اور ان کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ کس قسم کے لو سے اکڑ کر ملتے اور بے اعتنائی برتتے ہیں اور اس وقت میں تہِ دل سے اس بات کا قائل ہو گیا کہ ا فرعونوں کو ایسے ہی موسیٰ کی ضرورت تھی۔

(یہ مضمون شاہد حسین رزاقی کی زیرِ تکمیل کتاب ”یادوں کے چراغ“ کے ایک طویل با سے ماخوذ ہے)۔